بوستان یورپ

ڈاکٹر جمیل واسطی

ڈاکٹر جمیل واسطی کی یہ غیر مطبوعہ یادداشتیں ہیں جن کا تعلق مئی۔ جون ۱۹۳۸ء سے ہے جب کہ وہ فرانس میں تھے اور چند دن کے لئے لندن بھی گئے تھے۔ ان یادداشتوں کی اس حوالے سے زیادہ اہمیت ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا دوسری جنگ عظیم کی طرف بڑھ رہی تھی اور فرانس اس وقت دنیا کی دو بڑی اور عالمی طاقتوں میں سے ایک تھا۔ (دوسری طاقت برطانیہ تھی) تاریخ کی بہتر تفہیم کے لئے میں نے بعض جگہ حواشی تحریر کرنے کی جسارت کی ہے۔ ان حواشی کو مدیرہ کا اضافہ سمجھا جائے، اصل متن مضمون میں شامل نہ سمجھا جائے۔

(مدیرہ: نگار سجاد ظہیر)

فرانس کی سیر

میں نے مئی ۱۹۳۸ء اور جون کے دو ماہ طوغ Tours میں گذارے جس اسکول میں میں داخل تھا اسکا پتہ یہ ہے۔

"Institute Touraine, 1, Rue de La Grandie're,

Tours, France"

میری رہائش پہلے ڈیڑھ ماہ دریائے لوائر کے کنارے پر ایک خوبصورت کمرے میں تھی جو مکان کی دوسری منزل پر تھا اس مکان کی مالکہ کا نام مادام دووو Madam Duvot تھا اور اس کی لڑکی کا نام اینڈری Andre تھا جو دفتر میں کام کرتی تھی۔ مادام کا خاوند فوت ہو چکا تھا اور اس کی بڑی لڑکی الجیریا میں ایک افسر کی بیوی تھی۔ اسکی ایک بھتیجی یا بھانجی بھی تھی جسکا نام

Genvieve تھا جو اس مکان میں نہیں رہتی تھی بلکہ کبھی کبھی بریٹا فرسک (Breta Frisk) کو ملنے آیا کرتی تھی۔ جو اس گھر میں مقیم تھی اور فن لینڈ سے فرانسیسی پڑھنے آتی تھی۔ ۳۰ مئی کو (یا اس کے قریب) ایک Foyer یعنی جلسہ ہمارے انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں ہوا جس میں میرے ایک مصری دوست عبدالعزیز حلمی نے مصر پر ایک مقالہ پڑھا۔ معمولی مقالہ تھا۔ اس کی تقریر کے بعد مختلف سوالات شروع ہوئے۔ ایک اطالوی نے کھڑے ہو کر فرانسیسی میں پوچھنا شروع کیا کہ مصر میں عورتوں کی کیا حالت ہے اور یہ کثیر الازدواجی کا کیا جھگڑا ہے وغیرہ اس کا لہجہ نہایت حقارت آمیز تھا۔ اسکا جواب ایک اور مصری احمد حسن نے دینے کی کوشش کی۔ جواب معمولی تھا۔ یعنی یہ کہ کثیر الازدواجی اسلام میں منع ہے برابر کا انصاف عورتوں میں ناممکن ہے لیکن اگر کثیر الازدواجی جائز ہے تو صرف برابر کے انصاف کی حالت میں۔

مجھے فرانسیسی ٹوٹی پھوٹی آتی تھی لیکن میں نے اٹھ کر صدر جلسہ مسٹر پیرے مسٹوفلے (M. Pierre Mistaufle) جو طوغ میں ایڈووکیٹ ہیں سے اجازت مانگی کہ مجھے بھی اس موضوع پر کچھ کہنے دیا جائے۔ اجازت ملنے پر کھڑا ہوا اور تمام حاضرین سے معافی مانگی کہ اگر میری تقریر میں کوئی ناشائستہ الفاظ ادا ہو جائیں تو مجھے پیشگی معافی دی جائے۔ اگر پیشگی معافی نہ دی گئی تو میں تقریر نہیں کروں گا۔ تمام حاضرین جن میں نصف کے قریب عورتیں تھیں مجھے ہاتھ اٹھا کر معافی دے دی۔

اس پر میں نے نہایت غلط اور ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں تقریر شروع کی جس میں میں نے بتایا کہ انجیل ۲ کے پرانے عہد نامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کثیر الازدواجی یہودی رواج ہے۔ یہودیوں کے پیغمبر کثیر الازدواج تھے۔ سلیمان علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام کی کئی سو بیویاں تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ۳ دو بیویاں تھیں۔ حضرت محمد ﷺ بھی اس عبرانی سلسلہ نبوت میں آخری نبی تھے اس لئے اگر وہ بھی کثیر الازدواج تھے تو ان کو پیغمبر ماننے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جیسا کہ نئے عہد نامہ سے ظاہر ہوتا ہے کبھی کثیر الازدواجی کے خلاف ایک لفظ

بھی نہیں کہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سینکڑوں سالوں تک عیسائی کھلم کھلا بطور مذہبی حق کے کثیر الازدواج رہے۔ چوتھی صدی کے پوپ کا حکم ہے کہ آئندہ سے کلیسا کے پادری ایک سے زیادہ بیوی نہ کریں (بحوالہ ملٹن De Doctrina Christina) جس سے ظاہر ہے کہ عیسائی اس کے بعد بھی اور پادری اس سے پہلے کثیر الازدواج تھے۔ عیسائی بادشاہ شارلمین فریڈک آف بار بروسا، چلپرک سگرٹ جو خود فرانس کے بادشاہ تھے کثیر الازدواج تھے۔ پوپ گریگوری نے پہلی بیوی کے بیمار ہونے کی حالت میں دوسری بیوی سے بیاہ کی اجازت دی ہے۔ اور سینٹ آگسٹائن نے کہا ہے کہ اگر کسی ملک میں کثیر الازدواجی رائج ہو اور وہ ملک عیسائی ہو جائے تو کثیر الازدواجی رائج رہ سکتی ہے۔ مارٹن لوتھر نے اس رواج کو کتاب مقدس کے مطابق جائز قرار دیا (بحوالہ انسائیکلوپیڈیا بری ٹانیکا) امریکہ کے عیسائی فرقہ مارمن میں کثیر الازدواجی ۱۹۰۶ء تک رائج رہی اور ۱۹۰۶ء میں قانونی زبردستی سے روک دی گئی۔ ایک بیوی کا یورپ میں جو سول قانون ہے اس کا عیسائیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اور یہ سول قانون بھی مردہ ہے۔ کیونکہ اس پر کوئی عمل نہیں کرتا اس کے بعد میں نے انگلستان کی حرامزدگی کے اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ وہاں کیا اخلاقی موسم مہیا ہے اور اس حالت میں کثیر الازدواجی پر اعتراض کرتے رہنا کتنی بے شرمی ہے ایک پادری صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور انگریزی میں کچھ کہتے رہے تو میں چپ چاپ آ کر بیٹھ گیا لیکن ہمارے پریذیڈنٹ پیرے مسٹو فلے جو کٹر کیتھولک تھے پادری کے بعد کھڑے ہوئے اور کہنا شروع کر دیا کہ مسیو واسطی نے ثابت کیا ہے کہ لوتھرن اور مارمن پروٹسٹنٹ کثیر الازدواجی کو مانتے ہیں لیکن کیتھولک مذہب بالکل کثیر الازدواجی کے خلاف ہے اس پر میں نے اٹھ کر کہا کہ پوپ گریگوری مسلمان نہ تھا نہ سینٹ آگسٹائن مسلمان تھا دونوں کیتھولک اکابر تھے مگر مسٹو فلے صاحب نے پھر اصرار کیا کہ پروٹسٹنٹ فرقوں میں کثیر الازدواجی رائج رہی ہے۔ لیکن کیتھولک مذہب اس کے برخلاف ہے اس پر چند پروٹسٹنٹ اصحاب نے شور مچانا شروع کیا کہ جب مقرر تمام عیسائیوں کے متعلق بیان کر رہا ہے تم صرف کیتھولک کو کیسے مستثنیٰ کر رہے ہو وہ کیتھولک عیسائیوں کو شامل سمجھتا

ہے اس پر مسٹو فلے نے اور سب نے بولنا شروع کر دیا اور جلسہ گڑبڑ کی وجہ سے برخاست ہو گیا اس جلسہ میں ۲۵ اقوام کے لوگ (مرد و خواتین) موجود تھے۔ جب میں واپس آ رہا تھا مجھے در مائر لوائز کے پل پر دو عورتیں ملیں جو اس جلسہ میں شامل تھیں اور ہمارے انسٹیٹیوٹ کی طالبات تھیں اور انہوں نے مجھے بتایا کہ جو کچھ میں نے یورپ کے لوگوں کی بد اخلاقی کے متعلق بتایا تھا وہ بالکل درست تھا۔ حالات اس سے بھی بدتر ہیں اس کے بعد مسٹو فلے صاحب نے عزیز حلمی کو بہت کہا کہ وہ پھر ایک لیکچر دے جس میں یہ بیان کرے کہ اگرچہ کثیر الازدواجی مصر میں رائج ہے لیکن یہ کچھ نامناسب اور ناقابل عمل رواج ہے۔ حلمی نے غور کرنے کا وعدہ کیا اور مجھ سے ذکر کیا۔ احمد حسن عبدالعزیز حلمی اور میں نے بہت گفتگو کے بعد فیصلہ کیا کہ مسٹو فلے کی اس شر آمیز تجویز کو قبول نہ کیا جائے اور اس کو قبول کرنا محض اظہار حماقت ہوگا اس جلسہ میں ایک ترک جمال برآن بھی شامل تھا۔ خوبصورت نوجوان تھا نہایت موٹے شیشوں کی عینک لگاتا تھا اور مجھے ترکی کے حالات بتایا کرتا تھا پردہ کے متعلق اسکا رویہ تحقیر آمیز تھا لیکن اس جلسہ میں موجودگی سے اگلے روز جب پردہ کا ذکر آیا تو بہت شرمایا ہوا تھا اور کہتا تھا کہ نہیں پردہ نہ کرنے کا کوئی سرکاری حکم نہیں ہے لوگ خود ہی پردہ نہیں کرتے کہتے ہیں کہ ضمیر مضبوط ہونا چاہیے ہم پردہ کے خلاف نہیں ہیں حالانکہ ایک روز پہلے ہی پردہ کے خلاف حقارت آمیز گفتگو کر رہا تھا۔

عبدالعزیز حلمی اور احمد حسن دونوں میرے دوست ہو گئے اور اس کے بعد ہم بہت محبت سے رہتے تھے میں نے عبدالعزیز حلمی کو اسلامی روایات کے دوبارہ احیاء کے مسئلہ میں بالکل اپنا ہم رائے کر لیا۔ اور یہ کام چنداں دشوار اس لئے معلوم نہ ہوا کیونکہ عبدالعزیز حلمی بہت اسلام دوست انسان تھے وہ جامعہ ازہر کے پرانے طالب علم تھے۔

میں اپنی کتاب میں فرانسیسی الفاظ کے معنی اردو میں لکھا کرتا تھا ایک سردار صاحب موٹر کار کے مالک بھی اس مدرسہ میں فرانسیسی پڑھنے تشریف لائے۔ پہلے وہ معنی انگریزی میں لکھتے رہے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ میں اردو میں لکھتا ہوں تو انہوں نے گورمکھی میں لکھنا شروع

کر دیا۔ سردار صاحب جن کا نام میں اس وقت بھول چکا ہوں نہایت ہی شریف وخلیق انسان تھے غالباً امرتسر سے تعلق رکھتے تھے ان سے اکثر انسٹیٹیوٹ کے خوبصورت باغ میں گھنٹوں گورمکھی زبان میں گفتگو رہا کرتی تھی اور وہ مسجد شہید گنج کا گرانا سکھوں کا اخلاقی اور تاریخی حق خیال کرتے تھے۔ طوغ (Tours) میں کئی لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ صاحب جو تمہارے ساتھ آتے جاتے ہیں اور موٹر میں پھرتے ہیں کیا ہندوستان کے راجہ ہیں میں مبہم سا جواب دے دیا کرتا تھا اس آخری سوال کی وجہ یہ تھی کہ طوغ میں مہاراجہ آف کپورتھمہ بھی مقیم رہ چکے تھے اور یہ شہر ان کی یورپ میں خاص تفریح گاہ تھی ان کا ایک ہمراہی متھرا داس اسی گھر میں رہائش رکھ چکا تھا جہاں میں مقیم تھا اور Andre Duvot کے پاس اس کے کچھ خط اور کچھ تصاویر بھی تھیں۔

اس گھر میں میری میز پر اکثر سور کا گوشت آتا تھا جو میں نہ کھایا کرتا تھا اور شراب بھی مہیا ہوتی تھی جو میں نہ پیا کرتا تھا میرے نہ پینے کو دیکھ کر حاضرین نے شراب میں پانی ملانا شروع کر دیا لیکن سور کے گوشت کے متعلق وہ کچھ حقارت آمیز خاموشی کا رویہ اختیار کئے رکھتے تھے اور اگر کچھ فرانسیسی میں کہتے بھی تھے تو میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔

آخر ایک روز جبکہ نئے یہاں رہتے ہوئے کچھ دیر ہو گئی تھی اور میں کچھ نہایت ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی بول لیا کرتا تھا مجھے ہم طعام حاضرین میں سے ایک نے پوچھا کہ تم سور کا گوشت کیوں نہیں کھاتے میں نے بتایا کہ جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا تھا میں مسلمان ہوں اور ہمارے مذہب میں سور کا گوشت کھانا حرام ہے اس پر ایک آدمی نے بلند آواز سے کہا محمد ﷺ کا حکم ہے نا۔ اس لئے نہیں کھاتے۔ ایک نے کہا لیکن یہ ایسے عجیب حکم دینے سے کیا فائدہ۔ کہ خوراک نہ کھاؤ۔ اس کے خیال میں کسی اور چیز کا خیال آجاتا تو بچارے مسلمان اور اشیاء سے بھی محروم ہو جاتے۔

میں نے عرض کیا کہ ہم سور واقعی حضرت محمد ﷺ کے حکم کی وجہ سے اور قرآن کریم کے حکم کی وجہ سے نہیں کھاتے لیکن اس حکم کے پیچھے اور ہماری تعمیل کے پیچھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی محبت ہے۔ ایک نے کہا ہونہہ۔ عیسیٰ علیہ السلام کی محبت! مسلمان تو عیسائیوں کے اور عیسیٰ علیہ

السلام کے دشمن رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وہی درجہ دیتے ہیں جو آنحضرت ﷺ کو یعنی پیغمبری کا درجہ۔ اور اگر اس کے اعلیٰ درجہ یعنی الوہیت کا درجہ دے دیا جائے تو اسلام کے دو بنیادی اصول مسخ ہو جاتے ہیں۔ یعنی خدا کی وحدانیت اور انسان کی برابری اور اخوت۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ماننے سے خدا ایک نہیں رہتا اور ایک انسان کو خدا ماننے سے تمام انسان برابر نہیں رہتے۔ باقی رہا سور خوری کا سوال سو اس کی وجہ اسلام اور مسلمانوں کی عیسیٰ علیہ السلام سے محبت ہے۔

وہ کیسے؟

''آپ کو معلوم ہوگا'' میں نے عرض کیا کہ ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودی النسل تھے۔''

''ہاں''

اور شاید آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ یہودیوں میں سور خوری بالکل ممنوع ہے اور حرام ہے۔''

حاضرین میں سے ایک شخص نے نہایت کمزور اور دراز آواز سے کہا ''ہاں! ہم اسی لئے سور نہیں کھاتے۔''

میں نے عرض کیا ''کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام علاوہ دیگر یہودی مقدس پیغمبروں کے سور نہیں کھایا کرتے تھے۔''

تھوڑے وقفہ کے بعد جس میں ہم سب خاموش رہے میں نے پھر بولنا شروع کیا ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام'' خنزیر کا گوشت نہ کھاتے تھے۔ ہم مسلمانوں کو عیسیٰ علیہ السلام سے محبت ہے ہم ان کی پیروی میں سور کا گوشت نہیں کھاتے۔ آپ عیسائی ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پوجتے ہیں لیکن سور کا گوشت کھاتے ہیں جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پرہیز کیا کرتے تھے۔''

میں نے اسی تسلسل میں کہا ''آپ کلیسا جاتے ہیں تو وہاں شراب پیتے ہیں اور روٹی کھاتے ہیں اور آپ کا خیال ہے کہ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آخری دعوت میں کہا تھا کہ یہ شراب میرا خون ہے اور یہ روٹی میرا گوشت ہے اس لئے آج حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جسم سے

خوراک حاصل کررہے ہیں اور کلیسا میں شراب پینے اور روٹی کھانے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مقدس روح آپ میں داخل ہو جاتی ہے یہ درست ہے نا۔

سب نے ہاں ہاں کہا۔

''آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وہ معجزہ یاد ہوگا جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک عورت سے شیطانوں کو نکال سور میں داخل کر دیتے ہیں اور وہ سور بھاگ کر سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں۔

سب نے اس معجزہ سے اپنی واقفیت کا اظہار کیا۔

تو جب آپ کلیسا جاتے ہیں اور شراب پیتے ہیں اور روٹی کھاتے ہیں تو آپ کا خیال ہے کہ خدا کی روح آپ میں داخل ہو جاتی ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یعنی آپ کے خدا نے اس شراب اور روٹی کو اپنا خون اور اپنا گوشت کہا تھا کیا اسی طرح جب آپ سور کھاتے ہیں تو شیطان کی روح آپ میں داخل نہیں ہو جاتی کیونکہ اسی آپ کے خداوند حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شیطان کو سور میں داخل کیا تھا؟ حاضرین خاموش تھے لیکن اس مسئلہ پر غور بھی کررہے تھے ان کا رویہ کچھ بے بسی اور بے صبری کا اجتماع تھا۔

یہ عجیب ہے یہ عجیب ہے ایک شخص نے کہا اور دوسروں نے بھی کچھ اسی قسم کے الفاظ ادا کیئے۔ اس وقت ہماری میز پر سور موجود تھا۔ ایک عورت نے کھانے سے انکار کر دیا اور آئندہ جب تک کہ میں اس گھر میں مقیم رہا ہماری میز پر سور نہ آتا تھا جب تک کہ کوئی مہمان نہ ہو۔ اور اس صورت میں یا علیحدہ میز پر رکھا جاتا تھا یا مجھ سے دور کسی کونے پر ایک ناپسندیدہ خوراک کے طور پر رکھ دیا جاتا تھا۔ شروع میں جب میں اس گھر میں آیا تھا تو مجھ پر کچھ مذہبی تبلیغ بھی ہوتی تھی۔ نہایت آہستہ آہستہ لیکن یقینی۔ اب کوئی مذہب کی بات نہ کرتا تھا اور جب تک میں اس گھر میں رہا مذہب پر کوئی گفتگو نہ ہوئی۔

مگر میں اس گھر میں دیر تک نہ رہا۔ جولائی کا مہینہ ختم ہونے پر میں ایک اور گھر میں

منتقل ہوگیا اس تبدیلی کی وجہ میرے لارمور (Larmur) سے دوستی تھی یہ نوجوان شمالی آئرلینڈ کے شہر بلفاسٹ سے طوغ میں فرانسیسی پڑھنے آتا تھا۔ اور ہسپانوی اور فرانسیسی کی کسی ڈگری کے لئے تیاری کر رہا تھا۔ جب میں پہلے روز طوغ میں داخل ہوا تو میں فرانسیسی کا ایک لفظ نہ بول سکتا تھا اور Larmour نے مجھے گھر حاصل کرنے اور دیگر معاملات میں بہت مدد کی۔ اس کے بعد ہم اکثر ایک دوسرے سے ملتے رہتے اور دریائے لوائر پر سیر کیا کرتے تھے۔ میں نے شمالی آئرلینڈ کی علیحدگی کی مثال ہندوستان میں تحریک پاکستان پیش کی جس کو اس نے بہت پسند کیا۔ ہماری گفتگو عام روزمرہ کے مضامین پر ہوا کرتی تھی۔

لارمور Mme Broutz کے گھر Villa Martha میں رہا کرتا تھا جو Rue Moulin a Vent میں واقع ہے لارمور کے کہنے پر میں اس گھر میں چلا آیا۔ یہاں غالباً یہ لکھنا مناسب نہ ہوگا کہ میری پہلی میزبان مادام دودو (Duvot)۔ بہت مہمان نواز عورت تھی۔ اور اسکے گھر میں کھانا بہت اچھا اور باافراط ملتا تھا جس کمرے میں لامور رہتا تھا وہ عین میرے سامنے تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکا بھی اسی کمرے میں مقیم تھا یہ لڑکا Czech چیک تھا اسکا نام رچرڈ سائیکورا Richard Sykora تھا عمر لارمور سے بڑی تھی۔ دراز قد تھا۔ اور کچھ بے پرواہ سی طبیعت تھی۔ اکثر گاتا رہتا تھا Toujours Lamour جسکا دوسرا مصرع میں نے Bonjour Larmour بنادیا تھا آخر کو یہ مصرع ہمارا اسلام بن گئے۔ سائیکورا انگریزوں کے سخت خلاف تھا اور لارمور اور ایک انگریز جو اسی گھر میں مقیم تھا کہ منہ پر انگریزوں کو صلواتیں سنایا کرتا تھا۔ اگرچہ اس وقت چیکوسلواکیہ، جرمنی، کا حصہ نہ بنا تھا اور سوڈئن بھی جرمنی سے ملحق نہ ہوئے تھے لیکن معاملہ پیش نظر ضرور تھا۔ اور سکورا کا خیال تھا کہ انگریز جرمنی کی طرفداری میں چیکوسلواکیہ پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ ایک کمزور طاقت کو کم از کم اخلاقی امداد ہی دیں ایک زبردست طاقت کو خوش کرنے کے لئے الٹا چیکوسلواکیہ پر دباؤ ڈال رہے ہیں اور وہ نہایت بے صبری سے کہا کرتا تھا کہ اگر انگریزوں کو چیک لوگوں سے ہمدردی نہیں تو کم از کم خاموش

ہی رہیں۔ جرمنی کی طرفداری میں دخل کیوں دیتے ہیں۔

اس اسکول میں اور بھی کئی چیک نوجوان تھے۔ اور لڑکیاں بھی تھیں۔ یہ سب فرانسیسی اور انگریز اور دوسرے طالبعلموں سے دوستی گانٹھنے کی بہت کوشش کرتے تھے۔ اور اپنی حالت کے متعلق معلومات دیتے رہتے تھے۔ نیک شریف اور خلیق نوجوان تھے ابھی چیک غلام نہیں ہوئے تھے۔ اور غلامی کے خوف سے پریشان تھے معلوم نہیں یہ اب کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں اور سکورا آجکل کیا کر رہا ہے۔ اس اسکول کے طالب علم اپنے ساتھ بہت تعداد میں اپنے ممالک کے ڈاکخانہ کے ٹکٹ لائے تھے اور ملک کے ٹکٹ دینا اور ایک دوسرے کے ملک کے ٹکٹ مانگنا ایک عام رواج تھا میں نے بھی کئی ممالک کے ٹکٹ اکھٹے کر لیئے تھے۔ مادام بروتی میری نئی میزبان انگریزی جانتی تھی اور نہایت شیریں زبان عورت تھی اس کے خاوند کو ہم نے صرف چند مرتبہ آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ شکایت کیا کرتی تھی کہ اسکا خاوند ہمیشہ مخمور رہتا ہے اور نوجوان لڑکیوں کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ میور بروتی ایک ریٹائیرڈ ملازم تھا اور اسکی عمر پینسٹھ سال کے قریب ہوگی۔ مادام بروتی خود ساٹھ سال کے قریب تھی اس کی ایک لڑکی جو اپنے خاوند سے علیحدہ ہو چکی تھی مراکش ہی کے کسی تجارتی دفتر میں ملازم تھی۔

میرا کمرہ نہایت خوبصورت تھا اگرچہ چھوٹا تھا۔ اسکا پلنگ اتنا دراز اور فراخ نہ تھا جتنا کہ پہلے گھر کا۔ پہلے گھر کا پلنگ بذات خود ایک چھوٹے کمرے کی حیثیت رکھتا تھا میرے کمرے کی کھڑکی ایک وسیع منظر پر کھلتی تھی جو خوبصورت کوٹھیوں اور ان کے خاموش باغوں پر مشتمل تھا۔ ہمارے گھر کے پیچھے مادام بروتی کا ایک خوبصورت باغ تھا جس پر بہت محنت صرف ہوئی تھی۔ اور جس میں ٹماٹر بہت لذیذ پیدا ہوتے تھے ہمارا محلہ دریا کے پار ایک چھوٹے سے ٹیلے پر واقع تھا اور آب وہوا بہت خوشگوار تھی۔ یہ علاقہ بہت خوبصورت ہے اور طوئین کا ضلع بوستان فرانس کہلاتا ہے جیسا کہ فرانس خود بوستان یورپ مشہور ہے۔ جب لارمور، سکورا اور میں شام کو کھانا کھا کر سیر کو نکلتے تھے تو باغ گھر اور دریا اور آب وہوا نہایت دلکش معلوم ہوتے تھے۔

کبھی کبھی میں اور سائیکورا سیر کو نکلتے تھے سائیکورا رومن کیتھولک تھا اور اگر چہ اس کے دل میں اسلام کے خلاف کوئی کینہ نہ تھا وہ اسلام کے متعلق بہت غلط واقفیت رکھتا تھا اور جب میں اسے درست معلومات دیتا تھا تو وہ بہت دلچسپی کے ساتھ قبول کرتا تھا ہم قیامی کے مختصر سے عرصہ کے آخر تک اسکو اسلام سے کافی ہمدردی ہوگئی تھی۔ لیکن اس کے دماغ پر دن رات چیکوسلوا کیہ کی سیاسی حالت کا دباؤ تھا۔ ورنہ وہ ضرور اسلام کے متعلق اور بھی زیادہ دلچسپی کا اظہار کرسکتا تھا۔ مجھے اسکا ایک سوال یاد ہے۔ مجھ سے پوچھتا تھا کہ کیا تم میں بھی سینٹ ہوتے ہیں اور اگر ہوتے ہیں تو انہیں کون بناتا ہے اور انکو یاد رکھنا اور ان کے دنوں کو منانا تمہارا مذہبی فرض ہوتا ہے میں نے اسے بتایا کہ ہم میں نیک لوگ اور خدا شناس ولی ہوتے ہیں لیکن اسلام جمہوری مذہب ہے جو جس آدمی کو نیک اور خدا شناس سمجھے اسکو اپنا مذہبی پیشوا بنالے۔ اسلام کے اصول اخلاق کے اصولوں کی طرح دائمی ہیں اور جو مجھے ان اصولوں کو علمی اور عملی طور پر پیش کر سکے میرا مذہبی استاد ہے۔ اور جو اسکو مذہبی استاد نہ مانے اسکی مرضی ہے۔ وہ خود علمی تلاش کرے یا کسی اور کو مذہبی استاد بنائے اس کے لئے وہی سینٹ یا مذہبی پیرو ہے۔ کسی کو سینٹ ماننا ضروری نہیں محض ذاتی عقیدت کا مسئلہ ہے۔ غرض اس قسم کی اور بحث ہوا کرتی تھی۔ اس کا رویہ دوسرے لوگوں کی طرح اسلام کے خلاف تحقیر کا نہیں تھا۔ بلکہ وہ اسلام کو سمجھنا چاہتا تھا اور مجھ سے تبادلہ خیال کے بعد اسے یقین ہوگیا تھا کہ اسلام واقعی نیک اور معقول اصولوں پر قائم ہے۔

ہر ہفتہ ہمارے اسکول میں کسی شاتو Chateau یعنی شاہی یا رئیسی قصر کے دیکھنے کے لئے سیر کا انتظام کیا جاتا تھا اور کئی دفعہ طوغ کے گرجا اور پرانے مکانات محلات وغیرہ کو دکھانے کے لئے بھی ہمیں اکھٹا کیا جاتا تھا۔

ممکن ہے اس معاملہ پر میں لاہور پہنچ کر اور لکھ سکوں کیونکہ ان سیروں کا کچھ مواد لاہور بھیج چکا ہوں۔ [5] لیکن مجھے یاد ہے کہ ایک سیر اس قلعہ کے دیکھنے کے لئے تھی جس میں عبدالقادر امیر الجیریا [6] کو قید کیا گیا تھا۔ ایک سیر اس قلعہ کے کھنڈرات کو دیکھنے کے لئے صرف ہوئی تھی جس

میں جون آف آرک (Joon of Arc) شاہ چارلس سے ملی تھی۔ ہم نے وہ کمرہ دیکھا جس میں وہ مقیم رہی جس میں وہ شاہ چارلس کے سامنے پیش ہوئی۔ مجھے بلوا (Blois) کا خوبصورت شاتو بھی یاد ہے۔ جس میں ایک پکچر گیلری بھی ہے۔ اس کی ایک تصویر میں مجھے بھی بہت دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ تصویر تین خداؤں کی تصویر تھی۔ سب سے نیچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب تھے۔ صلیب تصویر کے عین درمیان میں استادہ تھی۔ ان کے سر کے اوپر ایک فاختہ کی تصویر تھی۔ یہ روح القدس کا نشان ہے اس کے اوپر ایک دراز ریش بزرگ کی تصویر تھی۔ یہ خدواند تعالیٰ بذات خود تھے میں نے یہ تصویر عبدالعزیز جلمی مصری کو بھی دکھائی۔

طوغ کا بڑا گرجا نہایت شاندار عمارت میں ہے اس کے دروازہ کے دونوں طرف کے بروج بہت بلند ہیں میں ایک پر چڑھا۔ اندر سے یہ گرجا وسیع اور خوبصورت ہے۔ داخل ہوتے بائیں طرف ایک عیسائی مجاہد کی تصویر ہے جس کے ہاتھ میں صلیبی جنگ کے لئے سونتی ہوئی تلوار ہے۔ اس گرجا کے ساتھ ایک اصنام کی نمائش گاہ بھی ہے۔ میں ایک رات اس گرجا میں گیا۔ تمام گرجا عیسائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ سپاہی اور بڑے بڑے آدمی موجود تھے۔ بینچوں کے درمیان کا راستہ پجاریوں سے پر تھا۔ بینچوں کے پیچھے قریباً پچھلی دیوار تک لوگ بھرے ہوئے تھے۔ گاہے گاہے مسلسل گھنٹیاں بجتی تھیں۔ اور لوگ گھٹنوں پر گر کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بت کے جو سامنے نصب تھا پوجا کرتے تھے۔ معلوم نہیں لوگ مشرق میں یہ کیوں کہتے ہیں کہ مغرب میں مذہب ختم ہو چکا ہے میں اس گرجا کے بعد کئی گرجاؤں میں اتوار کے روز گیا ہوں۔ گرجا پجاریوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں ہماری مسجدیں ہندوستان میں مقابلتاً بالکل بے رونق ہوتی ہیں۔ طوغ کے گرجا میں تھوڑی دیر ٹھہرا پھر واپس چلا آیا۔ عبدالعزیز جلمی اور میں نے طوغ میں یہ کوشش کی کہ شمالی افریقہ کے فرانسیسی محکوم مسلمانوں سے ذاتی راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہم نے چند سپاہی دیکھے تھے جو سفید رنگ کے نہ تھے اور ان کے سر پر رومی ٹوپیاں تھیں۔ ہم نے ایک دفعہ ایک اکیلے مہمان سپاہی کو سلام کیا عبدالعزیز نے اس سے عربی میں گفتگو کرنے کی کوشش کی

لیکن معلوم ہوا کہ اگر چہ وہ زبان وہ بولتا ہے جو عربی ہے لیکن بگڑ کر Dialect بن چکی ہے اور اس میں فرانسیسی کے بگڑے ہوئے الفاظ بھی شامل ہیں۔ اتنے میں اسکا ایک اور سپاہی رفیق بھی آ گیا اور ہم طوغ کے ہوٹل دی ویل یعنی ٹاؤن ہال کے سامنے کے چوک میں کھڑے ہوئے دیر تک ان سے گفتگو کرتے رہے۔ یہ گفتگو عربی اور فرانسیسی کے ان الفاظ کے بھروسے پر ہوئی جو اس سپاہی اور حلمی کے درمیان سانجھے تھے۔ ہم نے ان دونوں سپاہیوں کو اگلے روز Hotel du Cummerce میں چائے پر بلایا۔ ان دونوں نے قبول کر لیا۔ لیکن اگر چہ ہم اگلے روز دو گھنٹے تک اس ہوٹل میں انکا انتظار کرتے رہے لیکن وہ نہ آئے۔ ۸

۱۴ جولائی کا دن تمام فرانس میں آخری انقلاب اور آخری جمہوریت کے قیام کی خوشی میں منایا جاتا ہے ہر بڑے شہر میں فوجی سلامی ہوتی ہے اور بینڈ وغیرہ بجائے جاتے ہیں طوغ میں یہ سلامی ٹاؤن ہال کے سامنے کی سڑک پر تھی۔ میں صبح ہی وہاں جا پہنچا مکانات پر رنگین کپڑے اور جھنڈے آویزاں تھے دریچے، روشیں، جھروکے جھانکنے والی صورتوں سے پر تھے۔ تماشائیوں کا زبردست ہجوم تھا۔

صبح آٹھ بجے طوغ کے صدر بازار کے سرے پر بڑا فوجی افسر مع چند دوسرے افسروں کے کھڑا ہو گیا۔ سب افسر گھوڑوں پر سوار تھے۔ تلواروں اور ریوالوروں سے مسلح اور گھوڑوں کی گاہے گاہے مضطرب ٹاپ کے باوجود کافی استقلال سے نمائش کے اخیر تک قائم رہے۔

اس کے بعد پیادہ فرانسیسی فوج بینڈ باجوں کے ہمراہ گذرنی شروع ہوئی جب فوج کا دستہ افسر کے سامنے آتا تو منہ اسکی طرف موڑ لیتا تھا اور اسی طرح سے گذر جاتا تھا۔ افسر ماتھے تک ہاتھ اٹھا کر سلام کرتا تھا۔ ایک دستے کے بعد اور دوسرے دستے کے گذرنے کے درمیان وقفہ بہت دراز معلوم ہوتا تھا آخری دستہ مسلمان سپاہیوں کا تھا۔ ان میں ایک حبشی سپاہی بھی تھا۔ ان کی ٹوپیاں دراز چوڑی سرخ رومی ٹوپیاں تھیں۔ غالباً ان میں ہمارے وہ دوست بھی شامل تھے جو چائے پر آنے کا وعدہ کر کے چائے پینے نہ آئے تھے۔ مگر میں پہچان نہ سکا۔ ان کے بعد ٹینک اور

مسلح موٹر آنے شروع ہوئے۔ ٹینکوں اور مسلح موٹروں کے ساتھ لمبی لمبی دراز کاغذ یا کپڑے کے پھریرے ادھر ادھر بندھے ہوئے تھے۔

ان کے رنگ فرانس کے تین رنگ تھے یعنی نیلا، سفید اور سرخ ان سب مسلح گاڑیوں کے عین اوپر ایک فرانسیسی سپاہی بیٹھا ہوا ہوتا تھا جو گذرتا ہوا جرنیل کی طرف چہرے کا رخ پھیر دیتا تھا۔ جب یہ سب گذر گئے تو تھوڑی دیر کے بعد افسران بھی ان کے پیچھے روانہ ہو گئے اور ہجوم ادھر ادھر خوشی مناتا ہوا بکھر گیا۔

ٹاؤن ہال کے سامنے جو سڑک ہے وہ اتنی چوڑی ہے کہ اس کے درمیان ایک گھاس درختوں اور پھولوں سے آراستہ روش بنی ہوئی ہے جس پر کہیں کہیں بینچیں پڑی ہوئی ہیں میں ادھر ادھر پھرتا رہا کہ مجھے ایک بینچ پر ایک مسلمان سپاہی نظر آیا جس کے سر پر سرخ رومی ٹوپی تھی۔ میں اسکی طرف بڑھا اور پاس پہنچ کر میں اس کے ساتھ بینچ پر بیٹھ گیا۔

میں نے اس سے گفتگو کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ہندی مسلمان ہوں اور میں اسکی رومی ٹوپی سے اسکو مسلمان سمجھ کر آ گیا ہوں تا کہ اس کے حالات معلوم کر سکوں۔ وہ میری زبان بہت مشکل سے سمجھتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے ملازمت کرتے ایک طویل عرصہ ہو گیا ہے۔ اور چند سال میں اسے پنشن کا حق حاصل ہو جائے گا اس کی بیوی گھر میں ہے اور شاید اس نے اپنے ایک لڑکے کا بھی ذکر کیا لیکن جب میں نے اس سے پوچھا کہ شمالی افریقہ کے مسلمانوں کا کیا حال ہے تو وہ خاموش ہو گیا اور اسے سمجھنے میں مشکل زیادہ ہونی شروع ہو گئی۔ وہ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے پہلے بھی کچھ گھبراتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اب اسکی پریشانی بہت بڑھ گئی تھی۔ میں نے پھر اسکا نام پوچھا لیکن اب وہ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا اور اٹھ کھڑا ہوا اور تیز رفتار سے غالباً اپنی بیرک کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے اس کے اس رویئے سے کچھ حیرت ضرور ہوئی لیکن میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسلمان سپاہی فرانسیسیوں سے سخت خائف ہیں اور ہر مسلمان پر خفیہ ایجنٹ ہونے کا شک کرتے ہیں اور یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ فرانسیسی انہیں کسی مسلمان سے ملتا ہوا دیکھ کر سخت

ناراض ہوں گے۔اور معلوم نہیں کیا کریں گے۔اس کے بعد میں نے پھر دو تین مسلمان رومی ٹوپی ڈالے ہوئے سپاہیوں سے گفتگو کرنے کی کوشش کی لیکن وہ سب خائف ہو جاتے تھے۔انہیں ہر فرانسیسی جو پاس سے گذرتا تھا لرزا دیتا تھا اور ان سے گفتگو کرتے ہی یہ احساس ہو جاتا تھا کہ کسی نازک صورتحال سے مقابلہ ہے اور ان کی کوشش راستہ بدل لینے یعنی بھاگ اٹھنے کی ہوتی تھی۔ شاید ہر مسلمان سپاہی کے خلاف ہر جھوٹ سچا سمجھا جاتا ہو۔اور ان چند ہزار انسانوں میں جو بلا عدالت کے فیصلوں کے فرانس کے سخت گیر جیل خانوں میں پڑے سڑتے رہتے ہیں ایک بڑا حصہ ان بے چارے سپاہیوں کا ہو۔لیکن اتفاقاً میری ملاقات شمالی افریقہ کے ایک مسلمان سے ہوگئی اس نے مجھے بتایا کہ شمالی افریقہ میں مسلمانوں کی محکومی بہت ابتر ہے۔سرکاری اعلان کے ذریعے مسلمانوں کو دو ٹکڑے کر دیا گیا ہے۔کچھ مسلمانوں کو عرب کہا جاتا ہے۔اور کچھ مسلمانوں کو بربر۔ بربروں کو اس اعلان کے ذریعہ مسلمانوں سے علیحدہ کر کے شریعت اسلامیہ پر عمل کرنے سے قانوناً منع کر کے بربروں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی گئی ہے اس کوشش کی وجہ یہ ہے کہ بربران سفید اقوام کی اولاد ہیں جو شمالی افریقہ میں آباد ہوئیں۔اگر بربر عیسائی ہو جائیں تو فرانس کو انہیں فرانسیسی حقوق دینے میں اعتراض نہ ہوگا۔نیز یہ کہ فیض اور مقناس کے درمیان کی زرخیز زمینوں سے عربوں کو زبردستی نکال کر ان زمینوں کو فرانسیسیوں کو دے دیا گیا ہے اور عمل میں مسلمان مردوں اور عورتوں اور بچوں نے جو مظالم سہے ہیں وہ ناقابل بیان ہیں۔اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو تمام شمالی افریقہ میں مسلمان ختم کر دیئے جائیں گے اور ان کی قبروں پر اسی طرح یورپی اقوام آباد ہو جائیں گی جسطرح امریکہ میں امریکی عوام کی زندگی اور مذہب وتمدن کو برباد کر کے آباد ہو چکی ہے۔مجھے بعد میں پیرس لندن میں گفتگو سے اور کتب میں پڑھ کر یہ معلوم ہوا کہ اس کی یہ سب باتیں بالکل درست تھیں لیکن (میں اسکی ایک بات کو باور نہیں کر سکا) کیونکہ مجھے اسکا کوئی مطبوعہ حوالہ نہیں ملا کہ الجیریا کی کئی مساجد کو زبردستی گرجا بنایا گیا ہے یہ معاملہ کسی آئندہ سیاح کے لئے ایک قابل تفتیش مسئلہ ہے۔

اس یقین نہ آنے کی وجہ یہ نہیں کہ کوئی مسجد گرجا بن ہی نہیں سکتی۔ جب ہم جبل الطارق پر اترتے ہیں تو ہمیں شہر کے عجائبات کی فہرست دی جاتی ہے۔ جس میں یہ درج ہے کہ مریم تاجپوش کا گرجا اسلامی مسجد پر قائم ہے اور ہسپانوی تاریخ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ قرون وسطیٰ کے واقعات ہیں۔ جبکہ عیسائی دنیا نے رواداری کا سبق ابھی نہیں سیکھا تھا اور امریکہ کے غیر عیسائی اقوام کے قتل و غارت سے بھی پہلے کے واقعات ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں اس قسم کی حیوانیت فوری یقین کے قابل نہیں۔

مسٹو فلے ہمارے انسٹیٹیوٹ کے مجلسی پریذیڈنٹ میرے اچھے دوست بن گئے تھے۔ میں نے انہیں اور چند دوستوں کو ایک دو دفعہ چائے پر بھی مدعو کیا۔ درست خیال راست رو وکیل ہیں۔ فرانسیسی مادری زبان ہے لیکن بہت خوبصورت تقریر کرتے ہیں۔ مجھ سے ہندوستان کے حالات بہت ہمدردی سے دریافت کیا کرتے تھے اور ایک دفعہ انہوں نے مجھے اپنے گھر شربت کی دعوت پر مدعو بھی کیا۔ یہ ہماری آخری گفتگو تھی۔ ادھر ادھر کی بہت باتیں ہوئیں۔ وہ ہندوستان کے متعلق کافی معلومات رکھتے تھے۔ ایک اخبار نکال کر مجھے ہندوستان کے ہندوستانی رومن کیتھولک پادریوں اور مشنریوں کی تصاویر دکھاتے رہے۔ پوپ مرحوم ابھی زندہ تھے اور انہوں نے ایک سیاسی پارٹی کیتھولک ایکشن ترتیب دی تھی۔ موسیو فلے کیتھولک ایکشن کے بڑے حامی تھے۔ اور انکا خیال تھا کہ فرانس میں ایک زبردست مذہبی تحریک موجود ہے اسکو سیاسی طور پر منظم ہونا چاہیے۔ مجھ سے عیسائی اور غیر عیسائی حکومتوں کا ذکر کرتے تھے۔ میں نے ایک دو دفعہ مضمون کو بدلنے کی کوشش کی آخر میں نے پوچھا۔ کیا آپ البانیا ترکی، اور روس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟

''نہیں نہیں'' موسیو فلے نے کہا ''میری مراد جرمنی اور انگلستان سے ہے'' مگر میں ایک سال سے انگلستان میں مقیم ہوں میں نے عرض کی میں دیکھتا ہوں کہ انگریز بڑے مذہب کے پکے آدمی ہیں اتوار کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پرستش کے لئے گرجا بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیمبرج میں ایک بازار میں دس گرجا ہیں جن پر اولین خرچ اور مسلسل خرچ کا تخمینہ ملین پونڈ ہوگا۔

انگلستان کو غیر عیسائی ملک کہنا میرے خیال میں غیر مناسب ہے۔

''انگلستان عیسائی ملک نہیں ہے'' موسیو فلے نے کہا۔ انگلستان عیسائی روایات کو چھوڑ چکا ہے۔ صرف رومن کیتھولک مذہب عیسائی روایات کا حامل ہے۔

مگر میں نے چند انگریزوں سے اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے ان کا خیال ہے انگلستان کی مذہبی روایات ہی پروٹسٹنٹ عیسائیت ہے۔

اس پر موسیو فلے سے ضبط نہ ہو سکا۔ آپ کھڑے ہو گئے اور دروازہ کی طرف بڑھے اور اپنی زوجہ محترمہ سے خطاب کر کے کہنے لگے۔ مارگریٹا مارگریٹا سن سن یہ موسیو واسطی کہتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ عیسائیت بھی روایت کہلائی جا سکتی ہے۔ اندر سے مادام موسیو فلے جو بہت نوجوان تھیں باہر تشریف لے آئیں۔ اور یہ کہتی ہوئی آ کر کرسی پر بیٹھ گئیں بالکل مضحکہ خیز بات ہے! یہ عجیب بات ہے! مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں ایسی باتیں غلطی سے کہہ گیا ہوں جو میرے میزبانوں کے لئے بہت صبر آزما ہیں۔ اس لئے مجھے جلد پسپا ہو جانا چاہیے۔ نیز ایک عورت سے بحث فضول ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے عرض کیا ہاں میں آپکا مطلب سمجھ گیا ہوں یعنی یہ کہ پروٹسٹنٹ مذہب عیسائی روایت کہلانے کا حقدار نہیں ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ مذہب کے معاملہ میں ان میزبانوں کے سامنے مکمل اعتراف ہزیمت کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ لیکن انکا مذہب کا جوش کچھ میرے اندازے سے بھی فزوں تھا۔ ''اور انگلستان کے پروٹسٹنٹ مذہب میں بادشاہ پوپ کی بجائے ہے۔'' میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بیان کیا ''زیادہ مناسب تو یہ ہوگا کہ پوپ کو انگلستان کا بادشاہ بنا دیا جائے۔''

یہ صریح مذاق تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ ہنستے ہوئے ایسی عجیب تجویز کے خلاف احتجاج کریں گے۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ان دونوں نے نہایت جوش سے اس خیال کو لبیک کہا۔

''ہاں تو! ہاں تو! بالکل! مناسب تو یہی ہے۔ بالکل مناسب!'' وغیرہ وغیرہ اس کے

بعد مذہب کے معاملہ پر کسی قسم کی معقول گفتگو ناممکن تھی۔ میں نے انکے رشتہ داروں کے حال احوال پوچھنے شروع کر دیئے۔

میں نے عام طور پر محسوس کیا کہ طوغ میں عام فرانسیسیوں کا رویہ مسلمانوں کی جانب اور عربوں کی جانب نہایت ہی حقارت اور نفرت کا تھا۔ اور غالباً یہ کلیسا کی صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ ڈیڑھ ماہ طوغ میں رہ کر سیر ہو گیا تھا آخر میں نے پیرس جانے کی سوچی۔ عبدالعزیز بھی پیرس جا رہا تھا اور میرے ساتھ جانے کے لئے ایک روز ٹھہر گیا۔ اسے پیرس کی اچھی واقفیت تھی اور میرا خیال تھا کہ جس ہوٹل میں وہ ہمیشہ مقیم رہا کرتا تھا اس میں آرام سے ایک کمرہ کا بندوبست کر لیا تھا اور ہم ۱۶ جولائی کو طوغ سے روانہ ہوئے۔ طوغ بہت خوبصورت جگہ ہے۔ ہر مکان کے ساتھ ایک باغ ہوتا ہے۔ اور علاقہ نہایت ہی خوبصورت اور سرسبز ہے۔

گاڑی ۱۱ بجے کے قریب جاتی تھی حلمی اور میں اس میں پیرس کی جانب روانہ ہوئے۔ عربوں کا آخری فتح کردہ شہر ۱۰ دور تک گاڑی میں سے نظر آتا رہا۔ اسکا عظیم الشان گرجا کا دو برجوں والا دروازہ کئی میل تک درختوں کے اوپر سے شہر کا پتہ دیتا رہا۔

ہم گاڑی میں بیٹھے ہوئے اسلامی روایات کا ذکر کرتے تھے لیکن اس کے بعد ہم دوسری گفتگو میں مشغول ہو گئے پیرس چند گھنٹے میں گاڑی پہنچ جاتی ہے۔ ہم Rue Des Ecoles میں اکھٹے کار میں گئے اور حلمی کے پرانے ہوٹل Hotel de France et Orient میں ایک ایک کمرہ لیکر مقیم ہو گئے۔ حلمی یہاں بہت جلد اپنی پرانی دوستیوں میں گھل مل گئے۔ ہم دونوں اب اپنے اپنے امتحانات کی تیاری کرتے تھے۔ اور یونانی ہوٹل میں کھانا کھایا کرتے تھے۔

دوسرے تیسرے روز میں سٹی یونیورسیٹر گیا وہاں مجھے ایک نوجوان ملا۔ اسکا نام صالح بیگوچ تھا وہ یوگوسلاویہ کا باشندہ اور مسلمان تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مجھے بحیثیت ہندوستانی یہ ضروری نہیں ہے کہ میں ضرور برطانوی ہوسٹل میں داخل ہوں جو سب سے مہنگا ہوسٹل ہے۔ میں

سب سے ارزاں فرانسیسی ہوسٹل میں بھی داخل ہوسکتا ہوں۔ میں دفتر میں گیا۔ اور وہاں سے ماہوار رہائش کا کرایہ معلوم کیا۔ معلوم ہوا کہ فرانسیسی ہوسٹل Maison Dentche de la Meurthe کا کرایہ کوئی پونے دو پونڈ ماہوار ہے۔ اور یہ کرایہ ہمارے ہوٹل کے کرائے سے بالکل نصف تھا۔ میں نے واپس جا کر حلمی سے ذکر کیا اور چند روز میں اسباب لیکر میزون ڈش میں مقیم ہوگیا۔ (پہلے کمرے میں کھٹمل تھے اس لئے وہ کمرہ بدل دیا گیا) حلمی مجھے چھوڑنے ساتھ آیا۔ ہماری باتیں عام طور پر اسلامی روایات پر ہوتی رہیں اور ہم دونوں نے آپس میں وعدہ کیا کہ ہم اسلامی روایات کو دوبارہ زندہ کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ کیونکہ ان کو تباہ کرنے میں اخلاق کی موت ہے۔ عناصر قوت کا حصول نہیں جیسا کہ عام خیال ہے حلمی نے مجھے بتایا کہ پردہ کے ختم ہونے سے مصر میں زنا عام ہوگیا اور اسکا اب کوئی علاج نظر نہیں آتا۔ میں اس بات کا ذکر کرنا بھول گیا ہوں کہ پردہ کے حق میں حلمی نے مجھ سے ایک مضمون انگریزی میں لکھوایا۔ اس وقت ہمارے طوغ کے قیام کے آخری روز تھے۔ اسکا خیال تھا کہ وہ اس مضمون کو عربی میں ترجمہ کر کے کسی مصری اخبار میں چھپوا سکے گا۔ لیکن امتحان کے زور کی وجہ سے وہ اس مضمون کو ترجمہ نہ کر سکا۔ میں ہمیشہ پوچھتا رہتا تھا لیکن اس مضمون کو ترجمہ کرنے کا اسکا ارادہ ضرور تھا۔ کیونکہ وہ مانگنے پر واپس بھی نہ دیتا تھا۔ میں سٹی یونیورسیٹر سے کبھی شہر میں جا کر حلمی اس کے ہوٹل میں مل آیا کرتا تھا۔ خاص کر جمعہ کے روز کیونکہ اسکا گھر مسجد پیرس کے قریب تھا۔

پیرس مسجد میں علاوہ جمعہ کے اور روز بھی چلا جایا کرتا تھا۔ اور مغرب عصر کی نمازیں ادا کیا کرتا تھا اس مسجد کا موذن ایک دراز قد تنومند الجیری تھا جو فرانسیسی اچھی طرح بولتا تھا۔ اور ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان گئے تھے۔

میں اس سے عام گفتگو کیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ کیا میں جمعہ کے بعد فرانسیسی زبان میں کثیر الازدواجی پر لیکچر دے سکتا ہوں اس نے کہا کہ تمام وعظ مسجد میں حکماً بند ہیں۔ اور الجیریا میں بھی وعظ قانوناً بند ہیں۔ پیرس کی مسجد میں وعظ نہیں ہوسکتا۔ کسی قسم کی سیاسی

گفتگو کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں سیاست کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا محض اسلام پر جو کثیر الازدواجی کا الزام ہے اس کے متعلق کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ یہی کہتا رہا کہ یہاں سیاست کے متعلق گفتگو نہیں ہوسکتی۔ یہ غالباً اسکا ایک مصنوعی رویہ تھا اس نے یہ بھی بتایا کہ اسلام کے متعلق اس قسم کی تقریر کو پادری پسند نہیں کریں گے۔ اس لئے فرانسیسی حکام مسجد کے منتظمین سے ناراض ہو جائیں گے۔ فرانس کے تعصب کا مجھے اب کافی علم ہو چکا تھا اس لئے میں نے خاموش ہو جانا مناسب سمجھا۔ مجھے اس نے یہ بھی بتایا کہ اگر یہاں مسجد میں پانچ دس آدمی کھڑے ہو کر باتوں میں مشغول ہو جائیں جسے ہم سیاست سمجھیں تو ہم انہیں فوراً نکال دیا کرتے ہیں۔

مجھے آخری فقرہ کچھ زیادتی معلوم ہوتا تھا لیکن اگلے جمعہ ہی مجھے اس پر پوری طرح یقین آ گیا۔ میں اب چند آدمیوں سے واقف ہو گیا تھا۔ اور مجھے مسجد میں اور ہوسٹل میں معلوم ہوا کہ پیرس میں شمالی افریقہ کے عربوں کی ایک انجمن تعلیم ہے۔ مجھے انہوں نے پتہ بتایا اور وقت بھی بتایا۔ میں جب وقت پر بتائے ہوئے پتہ پر پہنچا۔ تو معلوم ہوا کہ جلسہ وہاں نہیں ہے۔ جگہ یونیورسٹی ہوسٹل سے اتنی دور تھی کہ مجھے دوسری جگہ جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور میں واپس ہو گیا۔ اگلے جمعے کو مسجد میں میں نے ان عربوں سے شکایت کی کہ مجھے جگہ اور وقت کیوں نہ بتایا گیا اور گفتگو کے دوران انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے حالات معلوم کئے میں انہیں بتا رہا تھا کہ اتنے میں وہ دراز قد موذن نازل ہوا اور مجھے بازو سے پکڑ کر مسجد کے دروازے تک لے گیا اس پر عربوں نے بلند آوازوں میں موذن کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور دو تین نوجوانوں نے اسے پکڑ لیا اور اس سے زبردستی کرنے لگے۔ میں کچھ کچھ عربی سمجھتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسجد میں کسی دور دراز کے مسلمان کی ہتک سخت نامناسب ہے۔ وہ اتنے جوش میں تھے کہ اگر میں حائل نہ ہوتا تو ضرور مسجد میں فساد ہو گیا ہوتا اور وہ موذن کو مسجد میں پیٹتے۔ میں نے انہیں کہا کہ موذن بیچارہ ملازم ہے اور نیک ایماندار ملازم ہے اور اپنی عقل کے مطابق مسجد کی خدمت کر رہا ہے اس لئے اسکا کوئی قصور

نہیں۔ باقی رہی گفتگو ہم مسجد کے باہر کھڑے ہو کر کر سکتے ہیں۔ اس موذن کا رویہ صرف شمالی افریقہ کے سیاسی حالات کی تخلیق ہے۔ اس واقعہ میں میرے ساتھ ایک اور ہندوستانی بھی شریک تھے جن سے میری ملاقات چند روز پہلے اس مطعم میں ہوئی تھی۔ جو مسجد سے ملحق ہے۔ ان کا نام عبداللطیف ہے اور یہ ناگپور میں جج ہیں۔ چھوٹا قد، داڑھی کھڑ بڑی، رنگ سانولا ان کی بیوی مطعم میں ان کے ہمراہ تھی۔ بیگم لطیف کی علالت جج صاحب کے سفر یورپ کا باعث تھی۔ بیگم ایک ہسپتال میں داخل تھیں۔ جج صاحب تبلیغ اسلام کے حامی ہیں اور مطعم میں بھی ایک عیسائی دوست پر تبلیغ میں مشغول تھے۔

مسجد سے باہر ہم کچھ دیر کھڑے رہے، عام باتیں ہوتی رہیں۔ عربوں نے مجھے ایک پتہ دیا اور پھر وقت دیا تا کہ میں ان کی انجمن تعلیم کے جلسہ میں شامل ہو سکوں یہ جلسہ نہایت دور جگہ جسکا پتہ مجھے اس وقت یاد نہیں ایک غریبانہ ہال میں منعقد ہوا تھا۔

اس جلسہ کی صدارت کی جگہ تین آدمی متمکن تھے ان میں سے ایک میرے دوست فضیل ارتلانی تھے جو الجیریا کے عرب ہیں اور جن سے عربوں کے Cercle d' Education de hard Africans, 7 bis Paris میں ہوئی تھی۔ جبکہ میں پہلی دفعہ وہاں جلسہ کے لئے گیا تھا اور جلسہ وہاں نہ تھا۔ اس وقت مجھے فضیل ارتلانی صاحب نے ایک کتاب Malaise Algeriens بھی مرحمت کی تھی۔ سو یہ فضیل صاحب صدر تھے اور ان کے ساتھ دو اور صاحب تھے۔ مجھے دیکھ کر یہ صدارت سے نیچے اتر آئے اور مجھے علیحدہ کمرے میں لے جا کر انہوں نے ایک بوتل لیمو بند پلائی۔ پھر مجھے ایک آدمی کی جگہ صدر پر بٹھایا۔ میں نے جلسہ کی جانب نگاہ کی۔ عرب چند سو کی تعداد میں ہوں گے۔ فرانسیسی ٹوپیاں ایک دو ترکی ٹوپیاں، پگڑیاں بھیں ننگے سر، کپڑے اکثر غریبانہ، چہروں سے تعلیم کے اثرات نمایاں نہ تھے۔ اکثر محض مزدور پیشہ معلوم ہوتے تھے ہال بہت صاف نہ تھا ارائش محض دیواروں پر کاغذ اور کپڑے کے پھریرے سے تھے جن پر کچھ دینی عبارتیں درج تھیں۔ بیٹھنے کے لئے کرسیاں نہ تھیں۔ بینچیں

تھیں۔ چھت بہت پرانی تھی اسی طرح دیواریں۔ فرش پر کوئی دری وغیرہ غالباً نہ تھی۔ اسلامی افلاس کا نقشہ نظر آ رہا تھا۔ ایک تقریر کے بعد مجھ سے درخواست ہوئی کہ میں کچھ عرض کروں۔ تقاریر عربی میں ہو رہی تھیں۔ اور یہ ظاہر تھا کہ حاضرین کا کافی حصہ فرانسیسی صرف اتنی جانتا ہے کہ پیرس میں زندگی کا گذارہ کر سکے۔

میں نے کھڑے ہو کر ہندوستانی مسلمانوں کی جانب سے شمالی افریقہ کے بھائیوں کو سلام علیکم پہنچایا۔ اور انہیں بتایا کہ میں انہیں مل کر بہت خوش ہوا ہوں کیونکہ ان کی زبان قرآن کی زبان ہے۔ اگر ہندوستان میں لوگ ان کے اخبارات دیکھ لیں تو اکثر ان میں سے ان کو چوم کر طاق میں رکھ دیں گے۔ کیونکہ وہ ان کو قرآن کریم کے اوراق تصور کریں گے۔ ہندوستان میں اسلام ایک ہزار سال حکمران رہا ہے۔ لیکن اس وقت حالات تشویشناک ہیں کیونکہ مسلمانوں کی علمی اقتصادی حالت اچھی نہیں اور وہ متحدہ ہندوستان میں اقلیت بننے والے ہیں۔ اور ایک اقلیت کی سیاسی حالت ہمیشہ اندوہناک ہوتی ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ حکومت اسلامی تعلیم کے حصول میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتی اور اکثر کالجوں میں عربی کے پروفیسر مقرر ہیں۔ ہماری عورتیں بھی عربی عورتوں کی طرح پردہ دار ہیں۔ اور ہم میں عربی تہذیب کی روایات بہت حد تک اب بھی زندہ ہیں اور ہم میں احساس ہے کہ مسلمان خواہ وہ کہیں ہوں آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ میں نے انہیں یہ بتایا کہ ہندوستانی انگلستان میں تبلیغ اسلام میں کوشاں ہیں اور انگلستان میں بہت سے انگریز مسلمان ہو گئے ہیں۔ انہیں بھی فرانس میں مشعل اسلام کی روشنی پھیلانی چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ

میری تقریر کافی غلط فرانسیسی میں ہو گی۔ لیکن میرے بیٹھ جانے کے بعد فضیل ارتلانی نے میری تقریر کا ترجمہ عربی میں سنایا۔ تبلیغ اسلام کے موضوع پر وہ بہت جوش اور خوشی سے بولے اور عرب بھی قدرے گرما گئے۔ میں تھوڑی دیر بیٹھ کر جلسہ ختم ہونے سے پہلے واپس چلا آیا کیونکہ مجھے عربی تقاریر سمجھ نہیں آتی تھیں۔

پیرس سٹی یونیورسیٹر کے قیام کے دوران میں سب کھانا میسون انٹرنیشنل (Maison

International) میں کھاتے تھے۔ یہ ایک عالیشان عمارت ہے۔ جس میں داخل ہوتے ہی ایک نہایت عالیشان سنگ مرمر سفید و سیاہ کے فرش والا ہال ہے اور اس کے پیچھے ایک اندر ہی برامدہ ہے۔ دائیں طرف دربان کی میز ہے جو ٹکٹ دیکھتا ہے تاکہ کوئی باہر کا شخص اندر کھانا کھانے نہ آجائے ہال کے سرے پر ایک طرف مختلف اقسام کے انتظامات ٹائلٹ کے لئے ہیں۔ ہاتھ منہ دھونے وغیرہ کے انتظامات ہیں اور ایک طرف دو Cafe Saloon ہیں اور سامنے دو بڑے ہال ہیں جن میں کھانے کا انتظام ہے۔ ایک لڑکی آپ کی سینی تیار کر دیتی ہے جسے آپ ایک چھجے پر پھسلاتے ہوئے لے جاتے ہیں اور اس میں جو رکھنا ہو رکھتے جاتے ہیں اخیر میں ایک اور لڑکی سب کی قیمت کا آپکو کاغذ دے دیتی ہے اور آپ سے اس کاغذ کے مطابق ایک لڑکی نکلتے وقت قیمت وصول کر لیتی ہے۔ قیمت بہت ہی واجبی ہوتی ہے۔ ہندوستانی طلباء کو ضرور سٹی یونیورسیٹر میں قیام کرنا چاہیے۔

کھانے کا کمرہ بہت ہی وسیع ہے۔ فرش سفید اور سیاہ رنگ کے سنگ مرمر کا ہے۔ کئی میزیں پڑی ہوئی ہیں۔ جن پر نمک، مرچ اور پانی موجود ہے گلاس آپ ساتھ سینی میں لاتے ہیں اور اپنی سینی اٹھا کر جس میز پر چاہیں بیٹھ جاتے ہیں اس ہوسٹل میں کھانے کے وقت یا کافی سیلون میں ویسے ہی چلتے پھرتے میں اس تلاش میں رہتا تھا کہ مجھے شمالی افریقہ یا یورپ کے مسلمان مل سکیں جن سے میں حالات علم معلوم کر سکوں اور اس مطعم میں مجھے اچھے اچھے دوست مہیا ہوئے جن میں سب سے قابل ذکر محمد المبارک ہیں (جن کا پتہ صرف عمارہ، دمشق، سوریا ہے) ان کے علاوہ سوریا (شام) کے اور نوجوان طلباء سے ملاقات ہوئی جو فرانس میں تعلیم کے حصول کی غرض سے آئے تھے۔ انور۔ عبدالکریم، باقی کفایہ اور چند دیگر اصحاب تھے۔ سب مغربی تہذیب کے دلداہ تھے اور مغربی تہذیب کو بلا تشریح قبول کرنے کو تیار تھے۔ میں نے ان کے سامنے اپنی تہذیب کی تشریح پیش کی۔ یہ تشریح ان سب کے پہلے حصول کردہ اور قبول کردہ خیالات کے بالکل منافی تھی۔ اس لئے بہت بحث وغیرہ ہوتی رہی۔ اگرچہ ان کے دماغ میری تشریح کو مانتے تھے

لیکن ان کے شبابی رجحان مغربی رنگینی کی طرف مائل تھے اور مغرب کی بداخلاقی کو یہ لابدی خیال کرتے تھے اور مغربی تہذیب کے عناصر قوت کو بلا امتزاج قبول کرنے میں زندگی کو بے رنگ خیال کرتے تھے لیکن ایک بات قابل ذکر ضرور ہے کہ ہم سب اکٹھے بیٹھ کر بحیثیت مسلمان ان معاملات پر گفتگو کرتے تھے جیسے کہ ہم سب کو ایک مسئلہ درپیش ہے جسکا حل تلاش کرنا ہم سب کا کام ہے سب مان جاتے تھے کہ میری تشریح درست ہے لیکن ''پر طبیعت ادھر نہیں آتی'' کا مسئلہ رہتا تھا۔ المبارک میری تشریح اور اعداد و شمار کے نتائج سے متفق تھے۔ انہوں نے میرے آنے سے پہلے میری درخواست پر میری ملاقات فضیل ارتلانی سے پھر کرائی۔ اور انہوں نے بھی مجھے اس عربی دائرہ کی اولین خبر دی تھی۔

فضیل ارتلانی ایک اور الجیری پروفیسر عربی کے ہمراہ تشریف لائے۔ ہم نے قہوہ اکھٹے پیا۔ اسلام پر گفتگو ہوتی رہی۔ خاص کر اسلام کے تبلیغی پہلوؤں پر۔

صالح بیگووچ میری تشریح کے مخالف رہے لیکن میرے دوست تھے۔ رائے کی مخالفت ہماری اس بنیادی دوستی کو نہ توڑتی تھی جو ہم دونوں میں اسلامی بھائی ہونے کی وجہ سے قائم تھی۔ میں کئی دفعہ ان کے کمرے میں ۴۲ میزون انڈو چائنا (42 maison Indo China) جا کر ان سے گفتگو کرتا رہتا تھا یہ ''میزوں'' ہند چینی کے طرز تعمیر پر بنایا ہوا ہے اور اسکے دروازہ پر شیر بنے ہوئے ہیں۔ اندر داخل ہوتے بائیں طرف ایک بڑا ہال ہے جو نہایت خوبصورت اور مزین ہے سامنے بھیانک شکلوں اور شیروں کے درمیان بدھ کی مورتی ہے۔ جو بہت بڑی ہے اور پیتل کی ہے۔ بیگووچ پردہ کے مخالف تھے۔ عناصر تہذیب مغربی کی نقل میں اسلامی دنیا کی ترقی کا راز سمجھتے تھے اور ہندوستان بحیثیت پروفیسر فرانسیسی آنے کو تیار تھے۔ ایک ڈگری فرانسیسی میں لے چکے تھے۔ دوسری ڈگری قانون کے لئے۔ اسلام میں عورتوں سے بے انصافی پر ایک مقالہ قلمبند کر رہے تھے اور مجھے سناتے تھے اور کچھ اس خیال سے بددل تھے کہ جس مقالہ کو سب بہ نظر تحسین دیکھتے رہے میں اس کے بنیادی اصول کے کیوں خلاف ہوں؟ ہر حالت

میں ہم دوست تھے۔

ایک اور یگوسلاویہ دوست سے بھی ملاقات ہوئی۔ اسکا نام پچانین مصطفےٰ تھا۔ یہ غریب یوگوسلاو بوسنی مسلمان تھا اور میزون دش ڈلامرتھ کے گھاس پر ایک بے تکلف مجلس میں بیٹھے ہوئے ہندوستانیوں سے پوچھتا تھا کیا تمہیں عربی آتی ہے۔ جیسے کہ اس نے مجھے بعد میں بتایا یہ ہندوستانیوں میں سے مسلمانوں کی شناخت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے اس مقصد کو پہچان لیا اور علیحدہ ہوکر پوچھا کہ اس کے کمرہ کا کیا نمبر ہے اس نے مجھے بتایا کہ وہ میزون ارجن ٹائن (؟) جو آخری دوسرے سرے پر ہے اس کے کمرہ ۵۲ میں مقیم ہے۔ میں وہاں گیا۔ اور دیر تک اس سے گفتگو کرتا رہا۔ مصطفےٰ غریب قریباً مفلس لڑکا ہے۔ عمر بیس اور تیس کے درمیان ہوگی۔ فرانسیسی کی تیاری کر رہا تھا۔ کھانے کے لئے سب سے سستے کھانے لیا کرتا تھا۔ سب سے کچھ علیحدہ رہتا تھا۔ میری اس سے بہت دوستی ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور سرب لڑکا ہوتا تھا۔ جو اس کو سیاسی معاملات میں منہمک رکھتا تھا۔ آخری دفعہ حلمی اور میں اس کو الوداع کہنے گئے تھے اور میں نے حلمی کو اس لڑکے کا خیال رکھنے کی تاکید بھی کی۔ میں نے مصطفےٰ پچانین سے عید ین پر عید کارڈ بھیجنے کا وعدہ بھی کیا اسکا پتہ یہ ہے۔ Pe'canin Mustafa, Rozoje, Zetska Banovina, Yogoslavia وہ عربی رسم الخط سے واقف تھا۔

مجھے چند فرانسیسی شمالی افریقہ کے لڑکوں سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا۔ جو اس وقت سٹی یونیورسٹی میں مقیم تھے۔ ان میں سے جو لڑکا میرا سب سے زیادہ دوست ہوا اسکا نام علی العقبی (Ali Elokby) تھا۔ یہ طیونسی تھا اسکا دادا فرانسیسیوں کے خلاف لڑتا رہا لیکن جب شکست ہوگئی تو طیونس میں چلا آیا اور بے کا ملازم ہوگیا اور اسطرح علی طیونسی بن گیا۔ علی ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرتا تھا اور جب مجھے کولائٹس (Colitis) ہوئی اور ہوسٹل کے ڈاکٹر نے کولائٹس کی تشخیص کی تو مجھے اپنے ہسپتال میں لے گیا اور مفت ڈاکٹروں کو دکھاتا رہا۔ تھوڑی سی انگریزی بھی جانتا تھا بعد میں اس نے مجھے کیمبرج میں ایک عید پر مبارک خط بھی بھیجا۔ مخلص مزاج انسان تھا۔ اس سے پہلے

تشریح الجذیب کے معاملہ پر اور تبلیغ کے معاملہ پر گفتگو رہتی تھی۔ یہ پردہ کے خلاف تھا لیکن اسلامی روایات کے حق میں تھا اور ایک دو دفعہ رومی ٹوپی ڈال کر میرے کمرے میں بھی آیا۔ اس نے مجھے آخری وقت میں سامان ڈھونے وغیرہ میں بھی مدد کی۔ کھانے کے بعد میں اور علی العقبی اکثر بین الاقوامی مکان کے باہر چاروں طرف گھوما کرتے تھے اور عام گفتگو ہوا کرتی تھی اس کے ذریعہ مجھے شمالی افریقہ کے اور بھی کئی لڑکوں سے ملاقات ہوئی۔ ان کے نام مجھے اس وقت یاد نہیں۔ البتہ سلیمان بن محمد (پتہ 9 Impasse Boutouria, Tunis) کا نام اس وقت مجھے یاد ہے۔ ان سے فرانسیسیوں کے مظالم اور محکوم مسلمانوں کی زبوں حالی معلوم ہوئی۔ فرانس کی متعصّبانہ مذہبی پالیسی کا حال بھی معلوم ہوا۔ الجیریا میں کوئی مسلمان کبھی کام کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ اسے فرانسیسی ہر وقت بیگار میں پکڑ سکتا ہے۔ اگر وہ کام نہ کرے تو اسے جیل میں ڈال دیا جاتا ہے اور اس پر کام سے انکار کے لئے مقدمہ چلایا جاتا ہے حالات ناقابل بیان ہیں۔

لندن کی سیر

لندن ۲۳ جون کی شام کو پہنچا، ۲۴ جون کو ۱۸ ریگلسٹن سکوائر کی مسجد میں ماموں جی کے ساتھ گیا۔ مولوی آفتاب الدین احمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ قادیانی احمدیہ مسجد والوں سے بہت شاکی تھے جن کے پروپیگنڈہ سے عیسائی یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کی کئی شاخیں ہیں اور درست اسلام نہ پہچان کر اسلام کی طرف رجوع نہ کرتے تھے۔ ایک انگریز جو مسلمان ہوا تھا قادیانی احمدیہ جماعت کی تبلیغ کی وجہ سے دوبارہ عیسائی بن گیا تھا۔ اسی مسجد میں مسٹر اسمٰعیل سیاد سے ملاقات ہوئی۔ جو برٹش سمال لینڈ کے مقتدر لیڈروں میں سے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ انگریزوں نے کوشش کی تھی کہ سمال لینڈ کے لاکھوں باشندے بلا تعلیم ہیں۔ تمام دفاتر کی زبان انگریزی رکھی ہوئی ہے۔ اور جو انگریزی نہ جانے اسے ملازمت نہیں دی جاتی۔

بہت بری حالت ہے لیکن عیسائی مذہبی تعصب محکوم مسلمانوں کی تعلیم کے راستہ میں بھی حائل ہے۔ اسی مسجد میں مسٹر امجد خان سے بھی ملاقات ہوئی جو لاہوری احمدی ہیں اور پردہ کے

خلاف ہیں۔مسٹر اسمٰعیل سیاد میرے ساتھ پھرتے رہے اور مجھے بوٹ بھی انہوں نے خرید وایا۔ اس کے بعد ہم امجد خان کے گھر گئے۔ وہاں شام کا کھانا کھایا یہاں مسٹر صدیقی سے بھی ملاقات ہوئی صدیقی گورنمنٹ پرنٹنگ انڈیا میں ہیں۔اور مسٹر اسمٰعیل سیاد صاحب کا پتہ یہ ہے۔ Mr. Ismail Siad, Djibuti مسٹر اسمٰعیل سیاد ملائے سمال لینڈ کے رشتہ دار ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ کبھی مجھے لکھیں کہ میں مسلمان گریجویٹ سمال لینڈ میں مدرس کے لیئے انتخاب کر کے بھیجوں۔غالباً مسٹر اسمٰعیل شیعہ ہیں۔

امجد صاحب کے ادھر ادھر ہونے پر صدیقی صاحب نے ہمیں امجد کی بیوی اور بچے کی فوٹو دکھائی۔ بیوی نہایت بھدی اور بدصورت معلوم ہوتی تھی لیکن امجد صاحب تھوڑی دیر کے بعد آ کر اس کے حسن کی تعریف میں مشغول ہو گئے۔امجد صاحب، مولوی محمد علی صاحب لاہوری کے نئے مرید ہیں اور مضبوط قادیانی ہیں لیکن پاکستانی بھی ہیں اور صدیقی صاحب کے ہمراہ چوہدری رحمت علی صاحب کو بھی مل آئے ہیں۔ دوسرے دن ہم خلیل سے ملنے گئے امتحان میں پاس ہو گیا ہے۔اور بہت مشغول تھا۔

۲۶ تاریخ کو ماموں جی کے ساتھ میں مسٹر عبداللطیف آرنلڈ کو ملنے گیا جو مراکو سے آئے ہیں۔انگریز ہیں اور مراکو کے قیام کے دوران میں مسلمان ہو گئے تھے۔لندن آ کر سب سے پہلے قادیانیوں میں پھنس گئے۔لیکن پھر چند روز پہلے قادیانیت کو خیر باد کہہ کر پوری طرح مسلمان ہو گئے تھے۔ان کا پتہ یہ ہے:

Mr. Latif Arnold, 26 Winbledon Park Road, London ان کی بیوی ڈیرہ دون ہندوستان کے ڈاکٹر کیمبل کی لڑکی تھی اور مسلمان ہو گئی تھی۔انہوں نے شربت اور پھل سے ہماری خاطر کی اور ہم ضرورت سے زیادہ بیٹھے رہے لیکن دلچسپ گفتگو رہی۔قادیانیت کی گفتگو بھی رہی۔مراکو کا ذکر ہوا۔کوئی خاص نئی بات نہ بتائی۔ ہسپانوی مراکو سے آئے تھے۔ میں نے عورتوں اور قادیانیت کی طرف سے بہت سے شکوک ان کے دل سے دور کیئے۔ وہ اسلامی

طریقہ اور پردہ کے بہت حامی تھے اور انکی بیوی ان سے زیادہ حامی تھیں۔ یہاں واپسی کے وقت مجھے گورنمنٹ کالج کا ایک پرانا طالب علم مسعود ملا۔ یہاں سے نکل کر ہم قادیانی مسجد میں جو قریب ہی تھی چلے گے۔ یہاں مولانا شمس سے ملاقات ہوئی جو بھڑ کدار قادیانی تھے۔ ان سے کچھ دیر بحث رہی۔ بہت گرم تھے لیکن جب میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مرزا غلام احمد شراب خوب پیتے تھے ان کے بل آج تک موجود ہیں۔ عدالت میں پیش ہو چکے ہیں تو گھبرا کر خاموش ہو گئے پھر ہم مولانا عبدالکریم درد کے کمرے میں چلے گئے آپ قرآن کریم کے ترجمہ میں مشغول تھے اور مرزا غلام احمد قادیانی اور قادیانیت کے ثبوت قرآن کریم سے ثابت کر کے تفسیر میں شامل کرنے میں مشغول تھے۔ چند باتیں کام کی بھی ہوئیں۔ قرآن کریم میں درج ہے کہ یہودی حضرت عذیر کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں انہوں نے یہودیوں کی ایک کتاب نکالی جس میں درج تھا کہ عذیر یعنی عذرا صغیر کو یہودی کبھی بھی خدا کا بیٹا نہ کہتے تھے نہ سمجھتے تھے غالباً آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا صرف نامکمل شہادت پر مبنی تھا، محض یہ ثابت کرنے کے لئے توحید اسلام کے باہر نا ممکن ہے۔ مولوی عبدالکریم درد اس نکتہ کی تفتیش پر مشغول تھے اور یہودیوں کی کتب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مغربی شراب خوری، بے پردگی اور عام بداخلاقی اور بدمعاشی کے خلاف تھے اور میری تجویز پر انہوں نے اعداد و شمار مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ پھر ہم دوبارہ شمس صاحب کے کمرے میں آئے یہاں چند انگریز ہندوستانی اور انگریز خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔

ماموں جی کے اصرار پر میں بھی چائے میں شامل ہو گیا اگر چہ میزبان چائے پر اصرار نہ کرتے تھے۔ یہاں مسٹر ناصر سے بھی ملاقات ہوئی۔ جو آکسفورڈ کے بی اے آنرز ہیں۔ مرزا بشیر الدین محمود صاحب کے لڑکے ہیں۔ گورنمنٹ کالج میں پڑھتے ہیں اور میری کلاس میں تھے۔ غالباً قادیان کے آئندہ خلیفہ ہیں۔ مصر میں قیام فرما کر واپس قادیان تشریف لے جائیں گے۔ مصر میں دینیات پڑھنے کا ارادہ ہے۔ عبدالکریم صاحب نے ایک واقعہ بیان کیا کہ جب پٹنی کی قادیانی مسجد کی بنیاد رکھنے کا وقت آیا تو انہوں نے شاہ عبدالعزیز ابن سعود ملک الحجاز کو تار دیا کہ وہ اگر سنگ

بنیاد نصب کریں۔ انہوں نے اپنے لڑکے امیر فیصل کو بھیج دیا لیکن اتنی دیر میں مخالفت کے اتنے تار ہندوستان، مصر اور اقصائے اسلام سے موصول ہوئے کہ امیر فیصل نے سنگ بنیاد رکھنے سے انکار کر دیا۔ اور ووکنگ کی جانب چلے گئے۔ اس معاملہ پر ماموں جی بہت ہی افسوس اور ہمدردی کا اظہار کرتے رہے جسکی وجہ سے بعد میں میں نے ان کے آگے زبردست احتجاج کیا۔ آخر کار پٹنی مسجد کا سنگ بنیاد سر عبدالقادر نے رکھا۔ سر عبدالقادر اس تمام معاملہ میں پٹنی والے قادیانیوں کے ساتھ رہے۔ خیر ہم چائے پی کر گھر آئے تو شام ہو چکی تھی۔ اگلی صبح کو میں پیرس روانہ ہو گیا۔ ماموں جی مجھے وکٹوریا اسٹیشن پر چھوڑنے آئے۔ یہاں سے میں نیو ہیون کی گاڑی پر سوار ہوا۔ امجد صاحب بھی مجھے چھوڑنے آئے تھے۔ نیو ہیون پہنچ کر ہم جہاز پر گئے۔ جو ٹھیک بارہ بجے روانہ ہو گیا۔ تین بجے ڈی ایپ Dieppe فرانس کے ساحل پر پہنچا یہ تین گھنٹے بڑی مشکل سے گذرے۔ میری طبعیت ویسے بھی اچھی نہ تھی۔ پھر جہاز کا سفر بہت قے کا دورہ رہا۔ میں لیٹا رہا۔ Dieppe سے ٹرین پر بیٹھ کر پیرس کی جانب روانہ ہو گیا۔

ایک جرمن سے ملاقات ہوئی جس نے مجھے اسباب چھڑانے، ترجمہ کرنے، اسباب طور Tours کی جانب روانہ کرنے، ہوٹل اور ٹیکسی کے معاملہ میں بہت امداد دی۔ میں نے اسے دس فرانک اسکے کرایہ کے دے دیئے۔ اس سے بہت باتیں ہوئی۔ میں نے اسے بتایا کہ مسلمان جرمنی سے بہت محبت رکھتے ہیں کیونکہ جرمنی پچھلی جنگ میں ترکی کا رفیق تھا۔ بہت خوش ہوا اور سب خدمت غالباً اسی دوستی کی وجہ سے ہی تھی لیکن ویسے بھی وہ نہایت نیک انسان معلوم ہوتا تھا۔

پیرس میں Hotel Jeanine d'arc, Rue de Buci میں ٹھہرا۔ غریبانہ تھرڈ کلاس ہوٹل تھا۔ اس میں چند امریکن طالب علم بھی مقیم تھے۔ ان میں سے ایک مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے عربی زبان کا مطالعہ کر رہا تھا۔ باقی دو David Levy , Philip Levy امریکہ۔ کے طالب علم تھے۔ میں انکے ساتھ Notre Dame Louvre کے گرجا گھر کی سیر کرتا تھا۔ پیرس کو دیکھتا رہا۔ مسٹر اسمٰعیل سیاد نے اس ہوٹل کا پتہ بتایا تھا۔ ہوٹل کے مالک کے ذریعے

میں نے پروفیسر Lazamian کو جو سوربون کا انگریزی کا پروفیسر ہے ٹیلیفون کرایا تا کہ ملاقات کا وقت مقرر کیا جائے۔ میرے ساتھ Basil Willey کا جو میرے ٹیوٹر ہیں خط تھا۔ دوسرے دن میں پروفیسر Lazamia کے گھر گیا۔ ان کا گھر 11, Rue de Monticelli میں واقعہ ہے۔ چالیس منٹ ملاقات رہی۔ جارج ایلیٹ پر بہت گفتگو ہوئی۔ اگلے روز میں اسلامی مسجد کو دیکھنے گیا جو پیرس میں واقع ہے میں اس مسجد کے ریسٹورنٹ میں داخل ہوا۔ باغ۔ چند چوکیاں۔ دیوار کے ساتھ بینچ جس پر گدے لگے ہوئے تھے۔ ترکی ٹوپی ڈالے ہوئے مسلمان پھر رہے تھے۔ نوکر کا نام حامد تھا۔ سلوار ڈالے ہوئے تھا۔ یہاں میں نے ترکی چائے جس میں پودینہ پڑا ہوا ہوتا ہے اور مراقشی حلوا تناول کیا۔ یہاں میرے ساتھ ایک بوٹ سوٹ ڈالے ہوئے عرب آن بیٹھے میں نے ان سے گفتگو شروع کی۔ وہ اردو، فارسی، انگریزی نہ جانتے تھے۔ سو میں نے عربی اور فرانسیسی کے الفاظ جوڑ کر ایک مضحکہ انگریز زبان بنائی۔ دونوں کے لئے ایک دوسرے کو سمجھنا نہایت مشکل تھا۔ ان عربی صاحب کا کارڈ جو انہوں نے مجھے دیا یہ تحریر لئے ہوئے تھا۔ His Imperial Highness Shenifion Prince مجھے اسوقت بالکل یقین نہ آیا۔ اور میں ان سے بالکل اس طرح گفتگو کرتا رہا جیسے کہ وہ میرے چھوٹے بھائی ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہندوستانی مسلمان شاعر مراقش کی بدقسمتی پر افسوس کے شعر کہتے ہیں اور ہندوستان کے مسلمان مراقشی بھائیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت پوچھی۔ مجھے اپنا کاسابلانکا کا پتہ دیا۔ میں نے ان سے ذکر کیا کہ کاسابلانکا میں تو مسلمانوں کا زبردست قتل ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اس وقت وہ بارہ سال کے تھے مسلمانوں کو مراکش میں دم مارنے کی اجازت نہیں۔ مکمل زبان بندی ہے۔ اور ذرا سے معاملہ پر قید اور قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنا پتہ بتایا۔ Moulay Hasan 41 Rue d' Ecoles, Paris 5 C اور کہا کہ اگر میں خط لکھوں گا تو وہ جواب دیں گے۔ اور بھی چند مراقشی امراء ریستوران میں داخل ہوئے۔ مراقشی ستار بج رہی تھی۔ اور دولڑکے عربی کے گیت

نہایت سریلی لے میں گا رہے تھے۔ اور لوگ ترکی چائے پی رہے تھے۔ کچھ فرانسیسی مرد اور عورتیں بھی جمع تھیں۔

ریستوران سے اٹھ کر میں مسجد کی جانب گیا۔ داخل ہوتے ہی باغ ہے۔ بائیں جانب جواب ہے دائیں جانب مسجد۔ ایک ڈیوڑھی سے گذر کر بڑا صحن ہے جس کے گرد برآمدے ہیں درمیان میں سنگ مرمر کا پھول نما پیالہ حوض کی طرح پانی سے بھرا ہوا کھڑا ہے۔ ہاتھ دھونے کا کمرہ ہے جہاں میں نے وضو کیا۔ پھر میں مسجد کے اندر گیا نہایت پھولدار کام ہے۔ اندر سے گنبد لکڑی کے کام کا ہے۔ غالیچے بچھے ہوئے ہیں۔ منبر نہایت بلند اور شاندار ہے۔ دونوں طرف دو جھنڈے کمخواب کے ہیں جس پر آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔ رنگ آسمانی ہے۔ درمیان میں کتبہ ہے۔ ''فواد اول ملک مصر''۔ دیوار پر چاروں طرف شیشے کے گلاس لگے ہوئے ہیں۔ جن میں بجلیاں روشن ہیں۔ میں نے غالیچوں پر نماز پڑھی۔ اور پھر واپس ہوا۔ ملک نے بہت امداد کی۔ وضو کے لئے جوتا بھی لا دیا۔ وغیرہ مگر میں عربی اور فرانسیسی نہ جانتا تھا۔ زیادہ گفتگو نہ ہو سکی۔

۳۰/جون کو Tours پہنچا۔ اسکول میں داخل ہوا۔ 7 Quai Paul Best میں قیام کر رہا ہوں۔ طور وہ شہر ہے جہاں ہسپانیہ سے بڑھ کر عربی عساکروں نے آخری فتح حاصل کی تھی۔ یہاں سے عربی حملہ کی واپسی شروع ہوئی۔ کچھ دیر یہ شہر عربی سپاہیوں کے ماتحت رہا ہوگا۔ پھر وہ اس سرزمیں سے رخصت ہو گئے۔ آج یہاں کے باشندوں کے مظلوم غلام ہیں۔ یہ آسمان اور یہ زمین عربی گھوڑوں کے ٹاپوں سے گونج چکے ہیں۔ اسلامی فوجیوں نے یہاں نمازیں پڑھی ہوئی ہیں۔ وہ فتحیابی کے نعرے ہائے تکبیر اب ہمیشہ کے لئے اس شہر کو الوداع کہہ گئے ہیں۔ اور اب ملائے حسن کی داستان زندہ ہے۔

حواشی

۱۔الجیریا اس وقت فرانس کے زیر تسلط تھا' یہاں فرانس نے ۱۳۲ سال حکومت کی (۱۸۳۰ء تا ۱۹۶۲ء) جب فرانسیسی یہاں آئے تو ان کا سابقہ ایک بہت پڑھی لکھی، خوشحال اور متمدن مسلمان قوم سے پڑا لیکن ایک سو بتیس سالہ دور تسلط کے دوران فرانسیسیوں نے اپنے مفادات کی خاطر اس شاندار ملک کو ہر طرح سے جہالت، غربت اور بدحالی کی چکیوں میں پیس ڈالا۔ ایک طرف اس ملک میں فرانسیسی مقتدر طبقہ ابھرا دوسری طرف ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں الجیریائی مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ ایک طویل جدوجہد آزادی کے بعد الجیریائی مسلمانوں نے ظالم جابر اور وحشی فرانس سے ۳ جولائی ۱۹۶۲ء میں آزادی حاصل کی۔

۲۔ درست لفظ بائبل ہوگا۔

۳۔ درست یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں تھیں، ایک سارا، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان سے تھیں اور لاولد تھیں دوسری حضرت ہاجرہ جن کا تعلق مصر سے تھا اور تیسری ایک کنعانی بیوی تھیں جن کا نام قطورا تھا۔

۴۔ شمالی افریقہ کے انتہائی مغرب میں واقع خوبصورت افریقی مسلم ملک مراکش اس وقت فرانس کے زیر تسلط تھا۔ مراکش پر باقاعدہ فرانسیسی انتداب (Protectorate System) ۳۰ مارچ ۱۹۱۲ء میں قائم ہوا۔ اس دور غلامی سے اہل مراکش کو ۳ مارچ ۱۹۵۶ء میں چھٹکارا ملا جس کے پیچھے ان کی سخت جدوجہد آزادی کارفرما تھی۔

۵۔ جناب جمیل واسطی کی یہ یادداشتیں مجھے ان کے بیٹے پروفیسر ڈاکٹر منیر واسطی (سابق صدر شعبہ انگریزی، کراچی یونیورسٹی) نے فراہم کیں، تاہم وہ اس مواد کے بارے میں لاعلم ہیں۔

۶۔ الجیریا (الجزائر) کی جدوجہد آزادی کا پہلا نامور ہیرو امیر عبدالقادر تھا جو ۶ ستمبر ۱۸۰۸ء کو الجزائر کے علاقہ گوئٹنا (Guetna) میں پیدا ہوا امیر کے والد محی الدین ایک چھوٹے سے علاقے مسکارا (Maşcara) کے امیر تھے۔ ۱۸۳۰ء میں جب فرانس کی ۳۷ ہزار افواج نے الجیریا پر قبضہ کر لیا تو اس کے خلاف جدوجہد کرنے والے اولین مجاہدین میں ایک عبدالقادر ہی تھے۔ وہ ۱۸۳۲ء تا ۱۸۴۷ء تک فرانس کے خلاف برسرپیکار رہے۔ اس پندرہ سال کے عرصہ میں کئی بار فرانسیسی افواج کو ہزیمت آمیز شکست بھی دی۔ اس نے سلطان مراکش سے بھی مدد طلب کی جس پر فرانس نے شدید ردعمل ظاہر کرتے ہوئے مراکش پر بمباری کی۔ دسمبر ۱۸۴۷ء میں وہ فرانسیسی فوجوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگئے۔

۱۸۵۲ء میں اسے نپولین سوئم نے رہا کیا تو وہ دمشق چلے گئے اور یہیں مئی ۱۸۸۳ء میں انتقال ہوا۔

۷۔ جون آف آرک فرانسیسی محب وطن دوشیزہ تھی جس نے فرانس کی آزادی کے لئے موت کو گلے لگایا اور زندہ جلنے

کی سزا قبول کی۔ جون آف آرک ۱۴۱۲ء میں فرانس کے دیہی علاقے لورین میں ایک غریب کسان کے گھر پیدا ہوئی اس کی ماں ازابیل ایک نیک سیرت عورت تھی اور باپ جیک ایک محنت کش کسان تھا۔ جون کی ایک بڑی بہن اور تین بھائی اور تھے جون نے ہوش سنبھالنے پر کھیتوں میں کام شروع کیا جہاں وہ گھر اور گاؤں میں انگریزوں کی سینہ زوری اور فرانس کی بے بسی اور فرانسیسی بادشاہ کی لاچاری کے قصے سنتی۔ جون ایک حسین وجمیل لیکن بہت بہادر لڑکی تھی۔ مذہبی خیالات کی حامل تھی اس نے محسوس کیا کہ غیبی آوازیں اسے چارلس ہفتم کی مدد کرنے کی تلقین کر رہی ہیں جسے انگریزوں نے تخت سے محروم کر رکھا تھا۔ کئی مرتبہ کی ناکامی کے بعد آخر اسے فروری ۱۴۲۹ء کو جبکہ وہ اٹھارہ سالہ دوشیزہ تھی ولی عہد چارلس تک پہنچنے کا موقع مل گیا۔ جون نے اسے اپنے خیالات اور پیغام سے آگاہ کیا بہت سے سوال و جواب اور بحث و مباحثہ کے بعد جون اور اس کے ساتھیوں کی وفاداری پر یقین کرتے ہوئے چارلس نے انہیں فرانسیسی فوج کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کرنے کی اجازت دی۔ جون کی موجودگی نے فرانسیسی فوج کا حوصلہ بلند کیا۔ جون نے مئی ۱۴۲۹ء میں آرلینز (Orleans) کو آزاد کرایا۔ اس نے لوائر کے کنارے کنارے اور مقامات بھی فتح کر لئے اور پاٹے (Patay) کے مقام پر انگریزی فوج کو شکست فاش دی ۱۷ جولائی ۱۴۲۹ء کو ریم (Reims) میں چارلس ہفتم کی رسم تاجپوشی ادا کی گئی۔ اس وقت جون بادشاہ کے پہلو میں موجود تھی۔ تاہم جون آف آرک کی بہادری اور شہرت سے بعض افراد حسد میں مبتلا ہوئے۔ جون اپنی یلغاروں کو جاری رکھنا چاہتی تھی مگر چارلس ہفتم کے مشیروں کے غلط مشوروں اور خود بادشاہ کی کاہلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے انگریزوں کے حلیف ڈیوک آف برگنڈی (Duke of Burgundy) سے مفاہمت کی گفت وشنید شروع کر دی۔ ۱۴۳۰ء میں چند غداروں نے جون کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ جہاں ایک کلیسائی عدالت نے اسے فاسق العقیدہ، دروغ گو، دغاباز اور جادوگرنی قرار دے کر اسے زندہ جلا دینے کی سزا سنائی۔ بالآخر ۳۰ مئی ۱۴۳۱ء کو اسے زندہ جلا دیا گیا۔ جون کی موت کے بعد ۱۴۵۶ء میں پھر ایک کلیسائی عدالت نے اسے سب الزامات سے بری قرار دیا اور باقاعدہ طور پر سینٹ (ولیہ) کا درجہ عطا کیا۔ اب ہر سال ۳۰ مئی کو اس کا خاص تہوار منایا جاتا ہے۔

۸۔ بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شمالی افریقہ کے محکوم مسلمان ممالک جو فرانس کے غلام تھے۔ اس کے نظام جاسوسی اور استبدادیت سے حد درجہ خائف تھے۔ افریقی مسلمانوں پر فرانس کے بدترین مظالم تاریخ کا حصہ ہیں۔

۹۔ ہسپانیہ یعنی اندلس (Spain) جو فرانس کے جنوب میں واقع ہے۔ تقریباً آٹھ سو سال تک مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ یہ ملک طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر نے ۷۱۱ء (۹۲ھ) میں فتح کیا۔ یہاں مسلمانوں کے اقتدار کا سورج ۱۴۹۲ء میں غروب ہو گیا۔ جب غرناطہ کا سقوط ہوا اور مسلمان یا ہلاک کیئے گئے یا ملک بدر کر دیئے گئے۔

۱۰۔ اس شہر کو عرب مورخین ''طلوشہ'' (Toulouse) لکھتے ہیں۔ ٹورس کی جنگ یعنی جنگ طلوشہ رمضان ۱۱۴ھ مطابق ۷۳۳ء میں ہوئی جس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور اسلامی لشکر قرطبہ واپس آ گیا۔ مغربی مورخین اس جنگ کو تاریخی اہمیت دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اسی لڑائی سے یورپ کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا اور فرانس میں مسلمانوں کی پیش قدمی کا سلسلہ رک گیا۔ چارلس جسکی سربراہی میں فرانسیسی فوج مسلمانوں سے نبرد آزما ہوئی تھی۔ اس جنگ کے بعد ہیرو قرار پایا۔ اسے ''چارلس مارٹل'' کہا جانے لگا۔ چونکہ اس جنگ میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے تھے اس لئے وہ اس مقام کو ''بلاط الشہداء'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔